فلسفۂ عجم پر ایک نظر

علی رضا طاہر

افراد و اقوام کے فکری سفر کا تجزیاتی و تحلیلی مطالعہ جہاں ان افراد و اقوام کی فکر کی تفہیم میں مددگار و معاون ہوتا ہے وہیں نوعِ انسانی کی آئندہ پیش رفت کے لیے راہ بھی ہموار کرتا ہے۔ لیکن یہ مطالعہ اسی صورت میں خاطرخواہ نتائج کا حامل ہوتا ہے جب فکری ارتقا کے تناظر میں ہو۔

جہاں تک فکر کی حقیقت و ماہیت کا تعلق ہے، نہ تو کوئی فکر اچانک اپنی نہائی منزل پر پہنچ جاتی ہے اور نہ ہی کوئی انسان پلک جھپکنے میں فکری بلوغت کے مراحل طے کر لیتا ہے بلکہ فکرِ انسانی کا ارتقا اور بلوغت ایک تدریجی عمل ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ مرحلہ وار آگے بڑھتا ہے۔

فکر کی ماہیت اور طبائعِ انسانی کا باہمی تعلق اقبال کے ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے، تشکیلِ جدید میں فکر کی ماہیت کو وہ یوں بیان کرتے ہیں:[۱]

> فکر اپنی ماہیت میں متحرک ہے ساکن نہیں ہے اور باعتبارِ زمانہ دیکھا جائے تو وہ اپنی اندرونی لامتناہیت کا اظہار اس بیج کی طرح کرتی ہے جس میں پورے درخت کی نمو پذیر وحدت ایک حقیقتِ حاضرہ کے طور پر شروع ہی سے موجود رہتی ہے۔

طبائعِ انسانی کی ارتقا پذیر نوعیت کو وہ ایک اور جگہ یوں واضح کرتے ہیں۔ ''زمانہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ انسانوں کے طبائع، ان کے افکار اور ان کے نقطۂ ہائے نگاہ بھی زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔''[۲]

اگرچہ عام افراد کی زندگی میں بھی یہ بات اہم ہوتی ہے لیکن نابغہ کے ہاں تو یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہوتی ہے، اقبال کی نظر میں اس ارتقا کی اہمیت خلیفہ عبدالحکیم کے اس بیان سے مزید واضح ہوتی ہے:

> میرے طالب علمی کے زمانے میں ایک مرتبہ علامہ اقبال نے مجھ سے فرمایا کہ میں بتاؤں کہ انسان کس وقت مرتا ہے، کسی آدمی کو اس وقت مردہ شمار کرنا چاہیے جب اس میں نئے افکار کی قبولیت کی صلاحیت جاتی رہے اور اس کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی ممکن نہ رہے، ایسی حالت میں زندگی، زندگی نہیں بلکہ مادے کی طرح محض تکرارِ عمل بن جاتی ہے۔[۳]

اپنی فکر میں ارتقا کی موجودگی، اور شخصیت وفکر کی تفہیم میں مطالعے کی اہمیت کی طرف اقبال ان الفاظ میں اظہار نظر کرتے ہیں۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی کے نام ۱۰/۱۱ کتوبر ۱۹۱۶ء کے ایک مکتوب میں کہتے ہیں:[۴]

اس کے علاوہ میں اپنے دل و دماغ کے سرگزشت بھی مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں اور یہ سرگزشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لیے نہایت ضروری ہے مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہوگا۔

اسی طرح عشرت رحمانی کے نام ۲۷/نومبر ۱۹۱۹ء کے ایک مکتوب میں اسی بات کو یوں بیان کرتے ہیں:[۵]

میری زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں جو اوروں کے لیے سبق آموز ہو سکے ہاں خیالات کا تدریجی انقلاب البتہ سبق آموز ہو سکتا ہے۔ اگر کبھی فرصت ہوگی تو لکھوں گا فی الحال اس کا وجود محض عزائم کی فہرست میں ہے۔

فلسفیانہ افکار و نظریات میں ارتقا اور تغیر و تبدل کی گنجائش اور موجودگی کی طرف اپنے خطبات، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کے دیباچے میں کچھ اس طرح اظہار نظر کرتے ہیں:[۶]

بایں ہمہ یاد رکھنا چاہیے کہ فلسفیانہ غور و تفکر میں قطعیت کوئی چیز نہیں۔ جیسے جیسے جہانِ علم میں ہمارا قدم آگے بڑھتا ہے اور فکر کے لیے نئے نئے راستے کھل جاتے ہیں۔ کتنے ہی نئے، اور شاید ان نظریوں سے جو ان خطبات میں پیش کیے گئے ہیں زیادہ بہتر نظریے، ہمارے سامنے آتے جائیں گے۔ ہمارا فرض بہر حال یہ ہے کہ فکرِ انسانی کے نشو و نما پر باحتیاط نظر رکھیں اور اس باب میں آزادی کے ساتھ نقد و تنقید سے کام لیتے رہیں۔

اقبال کی فکر کا ایک ایسا مطالعہ دراصل بیسویں صدی عیسوی میں اسلامی فکری روایت کے ارتقا، تسلسل اور روحِ عصر کے مطابق ڈھلنے کا مطالعہ ہے۔ جہاں تک فکرِ اقبال کا تعلق ہے۔ ڈاکٹر عشرت حسن انور نے کیفیات کے اعتبار سے اقبال کی فکر کو دو ادوار، ماقبل وجدانی اور وجدانی میں تقسیم کیا ہے۔[۷] جب کہ اقبال کے دیگر ثقہ محققین نے ماہ و سال کے اعتبار سے فکرِ اقبال کے تین ادوار بیان کیے ہیں:[۸]

۱۔ ابتدائی دور — ۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۵ء
۲۔ تشکیلی دور — ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء
۳۔ نہائی دور — ۱۹۰۸ء تا آخر (۱۹۳۸ء)

اگرچہ فکر کا ہر دور اپنی جگہ پر خاص اہمیت کا حامل ہوتا ہے لیکن عبوری دور تمام فکر میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس فکر میں جہاں ایک طرف گذشتہ فکری دور کے آثار موجود ہوتے ہیں، وہیں نہائی فکر کے دریچے وا ہوتے بھی نظر آتے ہیں۔ یہ دور ابتدائی اور نہائی فکر کا سنگم ہوتا ہے۔ اس دور میں ایک طرف فکرِ ماضی فراموش ہوتا نظر آتا ہے اور دوسری طرف فکرِ فردا جھانکتا نظر آتا ہے۔ اس فکری دور سے اس بات کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ جو روشِ فکر ماضی میں تھی آئندہ نہیں ہوگی اور جو آئندہ ہوگی وہ بستہ دہن شگوفوں کی صورت میں نظر آتی ہے۔ اس دورِ فکر میں کچھ ایسی جہاتِ فکر کی نشاندہی بھی ہوتی ہے جو اگرچہ ماضی میں بھی موجود ہوتی ہیں اور نہائی فکر میں بھی موجود ہوتی ہیں مگر نہائی فکر میں نئی آب و تاب کے ساتھ نئے پیرہن میں ہوتی ہیں۔ بہر حال یہ بھی

کہا جا سکتا ہے کہ یہ دور فکری منظر پر گزرتی ہوئی شب اور طلوعِ سحر کے درمیان کا فیصلہ کن لمحہ ہوتا ہے، جہاں کچھ فراموش ہو رہا ہوتا ہے، کچھ امانتیں، بہ کمال دیانت نئی آب و تاب اور نئے آہنگ کے ساتھ نئی دنیاؤں میں منتقل ہو رہی ہوتی ہیں، اور کچھ بالکل نئے آفاق اور نئی منزلیں دریافت ہو رہی ہوتی ہیں۔ اقبال کی فکر کا عبوری دور ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء قیامِ یورپ کا دور ہے۔ اس دور میں اقبال کا اہم ترین فکری کام ان کا ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا ہے۔

اس عبوری دورِ فکر کی اہمیت کو خود اقبال نے بھی بیان کیا ہے اور اس کی فکر کے ملکی و غیر ملکی مفسرین، شارحین، محققین اور مصنفین نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ ۲۷ نومبر ۱۹۱۹ء کے ایک خط بنام وحید احمد مدیر نقیب میں اقبال خود اس بات کا ان الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں:[۹]

حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے کبھی فرصت ہوئی تو اپنے قلب کی تمام سرگزشت قلم بند کروں گا، جس سے مجھے یقین ہے کہ بہت لوگوں کو فائدہ ہوگا۔

جہاں تک محققینِ اقبال کا تعلق ہے، تمام نامور مفکرین اور ثقہ افراد نے اس دور کی فکر اور اس دور کے نمایاں فکری کام بالخصوص اقبال کے تحقیقی مقالے ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا کی اہمیت کے متعلق اظہارِ رائے کیا ہے، اختصار کے پیشِ نظر ہم یہاں چند ایک آرا پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ایس ایم منہاج الدین، افکار و تصوراتِ اقبال میں کہتے ہیں:[۱۰]

بلا شک و شبہ یورپ کا یہ تین سالہ قیام اقبال کے روحانی ارتقا کی اہم ترین منزل ہے۔ اس قیام کے دوران آپ نے اسلام اور مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کے لیے جدوجہد کو اپنا نصب العین بنایا اور اپنی ساری تاب و توانائی اس عظیم مقصد کے لیے وقف کر دی۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، عروج اقبال میں یوں اظہار رائے کرتے ہیں:[۱۱]

اقبال نے اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں انگلستان اور جرمنی کے کتب خانوں میں جب مسلم علما و مفکرین کے علمی جواہر پارے، نادر مطبوعات و مخطوطات کی صورت میں محفوظ دیکھے تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس مشاہدے سے جہاں اسلاف کے علمی کارناموں سے اخلاف کی غفلت اور اس دولتِ بے بہا سے اپنی قومی محرومی پر انھیں افسوس ہوا (جس کا اظہار انھوں نے اپنی ایک نظم 'خطاب بہ نوجوانانِ اسلام' میں بھی کیا ہے) وہاں اس باثروت علمی و فکری ورثے کے سرسری جائزے سے ان کے دل میں اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی ثقافتی عظمت کا صحیح شعور بھی پیدا ہوا۔ یہ شعور و احساس انھیں مزید تحقیقی کام پر اکساتا رہا، اور وہ دیگر مسلم علما و محققین کو بھی حکمائے اسلام کے عمیق تر مطالعے کی دعوت دیتے رہے۔

ایک اور مقام پر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی یوں گویا ہیں:[۱۲]

اقبال کے فکری ارتقا کے سلسلے میں جس طرح ان کے سہ سالہ قیامِ یورپ (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) کو خاص اہمیت حاصل ہے، اسی طرح اس دور کے علمی و ذہنی اکتسابات میں ان کے اس تحقیقی کام کی مرکزی حیثیت بھی مسلم ہے

جس کی تکمیل میں وہ کم وبیش دو سال تک منہمک رہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان اپنی تالیف اقبال اور قرآن میں اقبال کے تحقیقی مقالے اور اس دورِ فکر کی اہمیت یوں بیان کرتے ہیں:[۱۳]

یہ مقالہ گو کہ شروع میں لکھا گیا تھا لیکن اس کا ذکر ضروری تھا، کیوں کہ علامہ اقبال کے ذہنی ارتقا کی بنیاد یہیں قائم ہوئی تھی۔

ڈاکٹر این میری شمل معروف جرمن مستشرق اور اسکالر اپنی معروف کتاب Gabriel's Wing میں رقم طراز ہیں:[۱۴]

تاریخِ مذہب میں اس مقالے کی اہمیت مسلّم ہے۔ یہ مقالہ ایران کے سلسلے میں مستشرقین کی دلچسپی کا ہی مظہر نہیں، اقبال شناسوں کے لیے بھی لحۂ فکر یہ فراہم کرتا ہے، کیوں کہ یہ کتاب فلسفۂ اقبال کا نقطۂ آغاز کہی جا سکتی ہے۔

جب کہ ایک اور مقام پر مذکورہ بالا کتاب میں ہی ڈاکٹر این میری شمل زیرِ بحث موضوع کے بارے میں اس نقطۂ نظر کا اظہار کرتی ہیں:[۱۵]

اقبال اس وقت اردو اور فارسی کے روایتی اثرات سے مسحور تھے۔ یورپ کے تین سالہ قیام نے اقبال کے لیے نئے افق کھولے۔

جہاں تک ایرانی محققین و مفکرین کا تعلق ہے عباس مہدوی اشرف،[۱۶] فضل اللہ رضا،[۱۷] اور حبیب یغمائی[۱۸] نے تو اپنی تالیفات و مقالات میں اقبال کے قیامِ یورپ اور تحقیقی مقالے کا ذکر سرسری انداز میں کیا ہے لیکن سید غلام رضا سعیدی،[۱۹] احمد احمدی،[۲۰] محمد تقی مقتدری،[۲۱] عبدالرفیع حقیقت،[۲۲] ڈاکٹر مہدی محقق،[۲۳] سید محمد محیط طباطبائی،[۲۴] احمد سروش،[۲۵] محمد حسین مشائخ فریدنی،[۲۶] اور ڈاکٹر شہین دخت مقدم،[۲۷] نے اپنی تالیفات و نگارشات میں اقبال کے قیامِ یورپ میں ان کے تحقیقی مقالے ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا کی اہمیت کو نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ اختصار کے پیشِ نظر ہم ان کی آرا کا خلاصہ بیان کرتے ہیں:[۲۷الف]

۱۔ اقبال کا یہ مقالہ اپنے اندر ایک اجتہادی شان رکھتا ہے۔

۲۔ ۱۹۰۸ء میں انگلستان میں اس مقالے کی اشاعت سے اقبال یورپ میں سرزمینِ مشرق کے ایک عظیم فلسفی کے طور پر متعارف ہوئے۔

۳۔ اقبال نے اس مقالے میں سرزمینِ ایران کی مختلف مذہبی، دینی اور فلسفیانہ تحریکوں اور گروہوں کے ظہور کے اسباب و علل کے متعلق نہایت گہرائی اور دقت کے ساتھ بحث کی ہے۔

۴۔ اقبال کے ایران سے تعلق و وابستگی اور طبعی میلان کا ثبوت صرف ان کی فارسی شاعری ہی نہیں بلکہ یہ بات ان کے تحقیقی مقالے سے بھی ظاہر ہے۔

۵۔ یورپ میں اقبال کا قیام اور اس دور کے مطالعات و تحقیقات ان کی ذہنی و فکری زندگی میں نہایت اہم

مقام رکھتے ہیں۔ اس دوران میں جہاں ایک طرف ان کا فکری افق بہت وسیع ہوا وہیں ان کی فکر میں انقلاب آفریں تبدیلیاں واقع ہوئیں، مثلاً مقالے کی تحقیق کے دوران مختلف مستشرقین اور مغربی فلاسفہ سے مباحث، مغربی فلسفے کے مطالعے اور اسلام میں فلسفہ، عرفان، کلام، اخلاق، تاریخ اور ادبی موضوعات پر نایاب فارسی کتب کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ:

(i)۔ آئندہ اپنے افکار کو پہنچانے اور پھیلانے کے لیے فارسی زبان کا قالب اختیار کرنا چاہیے۔

(ii)۔ وہ نیشنلزم، وطنیت اور نسل پرستی کے انسانیت کش اور بھیانک عواقب سے آگاہ ہو گئے۔

(iii)۔ پان اسلام ازم کے داعی و مبلغ اور وحدتِ اسلامی کے پرچم بردار بن گئے۔

(iv)۔ فکری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ عملی زندگی اور فعالیت و کوشش کی طرف ان کا میلان اور رغبت بڑھی۔

(v)۔ وہ اس کشمکش سے دوچار ہوئے کہ انھیں آئندہ شاعری کرنی بھی چاہیے یا نہیں۔

(vi)۔ مغربی افکار، تہذیب و تمدن اور نظامِ حیات کا قریب سے مطالعہ و مشاہدہ کرنے کے بعد، ان کی فریب کاریوں اور عیاریوں سے آگاہ ہوئے اور بالعموم نوعِ انسانی اور بالخصوص اسلامی دنیا کو اس سے بچانے کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔

(vii)۔ اس قیام اور مطالعے کے دوران وہ اس بات سے آگاہ ہوئے کہ بالخصوص امتِ مسلمہ اور بالعموم تمام اقوامِ مشرق کے زوال اور پس ماندگی کا سبب افلاطونی فلسفے کی پیروی، درویشی کا مفہوم = بے چارگی و تن آسانی، کوشش و جہد سے گریز، حقائق سے فرار، طبیعی دنیا کی طرف توجہ نہ دینا، اپنے آپ کو فنا کر دینا، ترکِ دنیا اور اپنے اندر موجود عظیم قوت (خودی) سے بے خبر رہنا ہے۔

(viii)۔ اس تحقیقی مطالعے کے دوران ہی اقبال اس نتیجے پر پہنچے کہ ترقی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان اپنے دینی، فکری، ادبی، اخلاقی، فقہی، عرفانی، انفرادی، اجتماعی غرض ہر شعبۂ حیات کی جدید تشکیل کریں۔

اقبال کے تحقیقی مقالے کے ترجمے کے دیباچے میں مترجمِ مقالہ میر حسن الدین نے تحقیقی مقالے کی اہمیت کے بارے میں اپنا یہ تبصرہ تحریر کیا ہے:[۲۸]

علمی دنیا میں تحقیقات کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ جو نظریہ آج رائج ہوتا ہے وہ کل متغیر ہو جاتا ہے۔ افلاطون اور ارسطو کے نظریات آج رائج نہیں تاہم ان کی تصانیف کو جو تاریخی اہمیت حاصل ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ علامہ اقبال کے خیالات میں گو بہت سا انقلاب آ چکا ہے تاہم پیشِ نظر کتاب کی تاریخی اہمیت قابلِ لحاظ ہے، عصرِ جدید کے مستشرقین اس کے حوالے اور اقتباسات پیش کرتے ہیں، جس سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب کی چند خصوصیات ایسی ہیں جو متعلمینِ فلسفہ کے لیے دلچسپی سے خالی نہیں۔ فرد کی طرح ہر قوم کے قالب میں بھی ایک مخصوص روح موجود رہتی ہے۔ اس کی ایک خاص سیرت

اور خاص طبیعت ہوتی ہے۔ علامہ اقبال نے ایرانی قوم کی مخصوص روح اور اس کی خاص سیرت کو اس کتاب میں منکشف کیا ہے۔

بلاشبہ مقالے کی تحریر کے بعد اقبال کے فکری رجحانات میں بعض جہات سے بعض سنجیدہ تبدیلیاں واقع ہونے کے باوجود اقبال کے اس مقالے The Development of Metaphysics in Persia کے کچھ اوصاف و امتیازات ایسے ہیں جن سے نہ صرف یہ کہ فکرِ اقبال، فکرِ ایران، اسلامی فکری روایت، اور ارتقائے فکرِ انسانی میں اس مقالے کی اہمیت آشکار ہوتی ہے بلکہ اس موضوع پر ہر دور میں اقبال کے ہی انداز میں مزید کام کرنے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اور مقالے کی یہی وہ جہت ہے جس کی وجہ سے اقبال کے فکر و نظر میں بعض جہات میں تبدیلی کے باوجود خود ان کی نظر میں بھی اس مقالے کی اہمیت مسلّم تھی اور تاریخِ علم و فکر میں بھی ہمیشہ مسلم رہے گی۔

اقبال کی فکر ارتقائے انسانی، احترام و وقارِ آدمیت اور تحفظِ شرفِ انسانیت کی فکر ہے۔ ہر دور کا انسان جب اپنے زمان و مکاں میں اپنے عصری تقاضوں کے تناظر میں فکرِ اقبال کا مطالعہ کرے گا تو اس پر فکرِ اقبال کے نئے امکانات و مضمرات آشکار ہوں گے اور ہر دور کے انسان پر ایک نیا اقبال منکشف ہوتا چلا جائے گا۔ لیکن ہر دور کے انسان کے لیے فکرِ اقبال کی کما حقہ تفہیم، فکر کی بتدریج تشکیل و تکمیل اور فکرِ اقبال کے حقیقی ماٰخذ و منابع اور اساسات تک رسائی حاصل کرنے کی خاطر اقبال کے اس مقالے کا مطالعہ ناگریز ہوگا، اس لیے کہ اقبال نے یہ مقالہ اپنی فکر کے عبوری دور میں تحریر کیا اور اقبال کی فکر میں یہ مقالہ ایک اہم ترین موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اقبال نے بیسویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۷ء) میں اس موضوع یعنی ایرانی مابعدالطبیعیات پر تحقیقی کام یورپ کی یونی ورسٹیوں میں پیش کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب اہلِ مغرب ایران کے فکر و فلسفہ کے متعلق بالکل ابتدائی اور سطحی سی معلومات رکھتے تھے۔ اس وقت تک ایران کے بارے میں جتنی کتابیں بھی تحریر کی گئی تھیں وہ یا تو تاریخ ایران کے بارے میں تھی اور یا کسی ابتدائی مفکر کے بارے میں تھیں۔ اس وقت اہلِ مغرب کو ایران سے اگر کوئی تعلق تھا یا آگاہی حاصل تھیں تو وہ صرف اس وقت کی استعمارگری کی فضا میں سیاسی مفادات کے حصول تک محدود تھی۔ اقبال نے پہلی بار تاریخ فکرِ ایران پر اتنی گہرائی، گیرائی اور جامعیت کے ساتھ قلم اٹھایا اور یورپ کی لائبریریوں میں ایک نادر تحقیق کا اضافہ کیا۔ اس سے جہاں اہلِ مغرب کو فکرِ ایران کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں وہیں فکرِ ایران کے کئی اہم گوشے پہلی بار دنیائے غرب پر آشکار ہوئے۔ اس بات کو اس وقت سے لے کر آج تک تمام نامور مفکرین نے تسلیم کیا ہے، مثلاً اہلِ مغرب کا خیال تھا کہ ایران میں ابنِ سینا کے بعد فلسفیانہ پیش رفت ختم ہوگئی یا جمود کا شکار ہوگئی لیکن اقبال نے زرتشت سے لے کر مزدک تک (قبلِ اسلام) اور الکندی سے لے کر ملّا ہادی سبزواری تک (بعد از اسلام) فکرِ ایران کے اہم افراد سے اہلِ غرب کو متعارف کرایا جن میں سہروردی بانیِ فلسفۂ اشراق اور ملا صدرا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور یوں مغربی ذہن کے لیے اقبال نے کمال مہارت کے ساتھ اس بات کا بیان و اثبات کیا کہ

ایرانی تاریخِ فکر استقلال، تسلسل اور ربط و نظم جیسی خصوصیات سے مالا مال ہے اور اقبال کے اس تحقیقی کام کے بعد ہی محققین تاریخِ فکرِ ایران کے اس پہلو کے مطالعے کی طرف مائل ہوئے جن میں Henry Corbin خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

جدید یورپ نے اپنے تمام تر افکار کی بنا سترھویں صدی عیسوی میں ماورائے حواس کے انکار پر رکھی اور اس طرح ان کا اصل مقصد ہر قسم کے مذہب اور بالخصوص الہام و وحی کا عملاً انکار تھا جو کہ قرونِ وسطیٰ کی پاپائیت وکلیسا اور جامد مسیحیت کے خلاف اس وقت کی مسیحی دنیا کا فطری ردِ عمل تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اہلِ مغرب کو اس بات کا گہرا شعور اور ادراک تھا کہ انھیں ان کی تہذیب اور نظامِ فکر کو جب بھی جس نظامِ فکر اور تہذیب و تمدن کا سامنا کرنا پڑے گا وہ 'اسلام' ہے اور یہ بات وہ نشاۃ الثانیہ کی منزل تک پہنچنے کے دوران مسلمان فلاسفہ کے نادر افکار، محیر العقول نظام ہائے فکر، اور عظیم اسلامی تہذیب و تمدن کے گہرے مطالعے کے دوران بخوبی جان چکے تھے۔ اس لیے کہ مسیحیت سے انھیں کوئی خطرہ نہ تھا۔ کلیسا کا استبداد ہمیشہ کے لیے دم توڑ چکا تھا، لہٰذا انھوں نے ایک طرف تو:

(ا)۔ اپنے تہذیب و تمدن، افکار اور علوم کی عظمت و برتری کے گن گانے شروع کیے اور اسے نوعِ انسانی کی منزل اور آئیڈیل قرار دیا (جس میں ظاہر بین افراد کے لیے بہت کشش تھی)۔

(ب)۔ اپنے تہذیب و تمدن اور علوم و افکار کے مقابلے میں ہر دوسری تہذیب و تمدن اور علوم و افکار کی نفی کی، ان کی بے مائیگی کو ثابت کرنے کی ہر جائز و ناجائز کوشش کی اور نئے ذہن میں اس کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کیے۔ جیسا کہ قبلاً بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ جانتے تھے کہ انھیں صرف اور صرف اس جنگ میں اسلامی تہذیب و تمدن اور علوم و افکار سے سابقہ پڑے گا لہٰذا انھوں نے اس سلسلے میں یہ روش اپنائی:

(i) اسلام کی تاریخِ فکر کو توڑ موڑ کر پیش کیا۔

(ii) اسلام کی فکری روایت کو غیر مربوط، غیر مسلسل، مبہم اور منقطع روایت کے طور پر متعارف کروایا۔

(iii) اسلام میں تمام علمی و فکری پیش رفت کو ابنِ سینا اور ابنِ رشد پر تمام کر دیا اور پراپیگنڈہ کیا کہ ان کے بعد مشرقی زمین پر فلسفے کے سوتے خشک ہو گئے۔

(iv) تمام فلسفیانہ علوم کلام، فلسفہ اور تصوف کو باہمی طور پر غیر مربوط اور غیر متعلق کے طور پر پیش کیا اور یہ ظاہر کیا کہ ان تینوں علوم کا آپس میں بالکل کوئی تعلق نہیں، یہ تین الگ الگ خانے ہیں۔

(v) تمام مسلمان متکلمین، فلاسفہ اور متصوفین کا غیر تحقیقی صلاحیتوں کے حامل اور چربہ ساز کے طور پر ذکر کیا اور اسلام میں کلام، فلسفہ اور تصوف کو یونانیت، عیسائیت، مجوسیت، بدھ مت، یہودیت اور ہندو ویدانت کے زیرِ اثر قرار دیا۔

(vi) اسلامی فکری روایت نامی کسی چیز کے ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

(vii) اسلامی دنیا میں رنگ، نسل، زبان اور جغرافیہ کی اساس پر وحدتِ اسلامی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے

عربی فلسفہ، ترکی فلسفہ، ایرانی فلسفہ اور مصری فلسفہ جیسے متعصّبانہ نظریے کو عام کیا تاکہ مسلمانوں کی کوئی فکر، کوئی سوچ، کوئی روایت اور کوئی باہمی تعلق باقی نہ رہے۔

(viii) مذہب، ماورائے حواس، الہام، کشف، شہود اور تصوف جیسے موضوعات کو دائرۂ علم سے خارج کر دیا۔

اقبال نے اپنے تحقیقی مقالے کے باب اوّل[۲۹] اور باب پنجم[۳۰] کے ابتدائیہ میں اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۱ء[۳۱] کے ایک خطبے میں اس بات کی نشاندہی کی اور یورپ میں ایران میں مابعد العطبیعیات کا ارتقا کے عنوان کے تحت تحقیقی کام کر کے حتی المقدور ان کے مذکورہ بالا پراپیگنڈہ کا نہایت عمدگی سے عالمانہ طور پر ردپیش کیا اور نئے آنے والے ذہن کے سامنے تحقیق کی ایک نئی اور دیانت دارانہ طرح ڈالی۔

(i) اقبال نے اسلامی فکری روایت کو ایک تسلسل، ربط، تبیین اور نظم کی حامل روایت کے طور پر پیش کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی۔

(ii) کلام، فلسفہ اور تصوف کے میدان میں مسلمان دانشوروں کی کاوشوں کو ممکنہ حد تک نمایاں کرنے کی کوشش کی۔

(iii) مذہب اور ماورائے حواس (کشف، شہود، الہام) کا نہ صرف یہ کہ اثبات کیا بلکہ تصوف کو اسی اساس پر ثابت کیا۔

(iv) کسی زبان، علاقے، یا نسل وقوم کے تعصب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسلامی فکری روایت کو بیان کیا۔

(v) اسلامی فکری روایت میں ایرانیوں کے حصے کو مشخّص و ممیّز کیا۔

جیسا کہ قبلاً ذکر کیا جا چکا ہے کہ اقبال کو ایران میں مابعد الطبیعیات کے ارتقا سے خصوصی دلچسپی تھی، اس لیے کہ اسلام کی فکری، تہذیبی اور تمدنی تشکیل میں ایران کا حصہ نمایاں اور ممتاز ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان اور ایران کی علمی، فکری، تہذیبی، اور تمدنی روایت مشترک ہے، خود اقبال مصور و مفکرِ پاکستان انیسویں صدی عیسوی میں بالخصوص برصغیر اور بالعموم پوری اسلامی دنیا میں اسلامی فکری روایت کو نئے سرے سے متشکّل و مشخّص کرنے والا ہے، لہٰذا ہر دور میں فکرِ اقبال، فکرِ ایران، برصغیر میں اسلامی فکر اور اسلامی فکری روایت کے حوالے سے جب بھی کام آگے بڑھایا جائے گا اقبال کا یہ تحقیقی مقالہ ضرور پیشِ نظر رکھا جائے گا۔

اقبال کی نہائی منزلِ فکر پر اصولِ اجتہاد کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ اقبال کی فکر میں اس روش و نہج کی ابتدا واضح طور پر اس مقالے میں نمایاں ہوتی نظر آتی ہے۔ اس مقالے میں اقبال جب اپنے اس وقت کے فکر و نظر کے تناظر میں فکرِ یونان اور مسلمان فلاسفہ پر بے لاگ تنقید کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ جب وہ مسلمان فلاسفہ کو دورِ حاضر کے جدید فلسفوں اور نظریات کا پیش رو قرار دیتے ہیں تو اس سے ان کی فطرت کی اجتہادی روش و میلان کی نشاندہی ہوتی ہے جس نے آگے چل کر ان کی فکری عمارت کی تشکیل میں ایک اہم بنیاد کی حیثیت اختیار کر لی مگر اس اجتہادی میلان کی نشاندہی اس مقالے میں واضح طور پر ہو جاتی ہے۔

اقبال اگرچہ اوائلِ عمر میں ہی فارسی زبان کے نامور شعرا، عرفا اور حکما سے آگاہ تھے مگر ان کے شعر و نثر میں ان کا تذکرہ باقاعدہ طور پر اور دقیق انداز میں اولاً ان کے اس تحقیقی مقالے میں ملتا ہے، اور ثانیاً اس مقالے کی تحریر کے بعد کے تمام نثری و شعری آثار میں موقع و محل کی مناسبت سے ان حکما، عرفا اور شعرا کا ذکر ملتا ہے۔ اگرچہ مقالے سے قبل کی تحریروں میں بھی اقبال کی توجہ فارسی زبان کے ان نمایاں لوگوں کی طرف رہی ہے (مثلاً یورپ جانے سے قبل انھوں نے عبدالکریم الجیلی کے نظریہ 'انسانِ کامل' پر ایک نہایت عمدہ مضمون تحریر کیا جو انڈین انٹی کیوری میں شائع ہوا مگر ایسا شاذ ہے لیکن مقالے کے بعد کی شعری و نثری تحریروں میں سعدی، جامی، انوری، سنائی، عرفی شیرازی، صائب، عطار، فردوسی، فیضی، قاآنی، حافظ (باوجود حافظ سے تمام تر اختلاف کے)، شبستری، منصور حلاج، فارابی، سہروردی، ابنِ عربی، عراقی، غزالی، مسکویہ، سینا، رازی، ہادی سبزواری، ملّا دوانی، میر باقر، میر داماد اور بالخصوص رومی کا ذکر ملتا ہے متکلمین میں سے معتزلہ اور بالخصوص اشعری مکتب کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔ اس سے جہاں فکرِ اقبال کی تشکیل میں مسلمان حکما، عرفا، اور شعرا کے حصے کی نشاندہی ہوتی ہے وہیں فکرِ اقبال کی تشکیل میں اقبال کے تحقیقی مقالے اور اس ضمن میں ان کے مطالعات کی اہمیت بھی آشکار ہوتی ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر حسین مجیب المصری کہتے ہیں جو شخص فکرِ اقبال کی تشکیل کا کماحقہ، ادراک چاہتا ہے وہ اقبال کے اس مقالے سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔[۳۲]

تاریخ فکر میں مدتوں کے بعد انھوں نے مشرق و مغرب کی ان دو مختلف الاساس روایت ہائے فکر میں ربط و تعلق اور قرب و بعد تلاش کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی ساتھ مختلف اوقات میں مختلف نظام ہائے فکر کے پیرو افراد کے اذہان میں باوجود بعدِ زمانی کے ایک ہی جیسے افکار کی رستخیزی کی نشاندہی کی۔ اقوام کی فکری تاریخ میں مختلف نظام ہائے فکر کا اپنی فکری اساس کے تناظر میں مطالعہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے ان رویوں اور رجحانات کی بنیاد پڑتی ہے جن پر کام کر کے آئندہ پیش رفت کے لیے لائحۂ عمل مرتب ہوتا ہے اور قوموں کی زندگی میں یہی وہ نازک مگر اہم ترین مقام ہوتا ہے جب انھوں نے اپنی اساس پر قائم رہتے ہوئے جدید زمان و مکاں کے مقتضیات کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرنا ہوتا ہے۔ تاریخ فکرِ اسلام میں بالخصوص اور تاریخ فکر میں بالعموم صدیوں کے بعد اقبال نے یہ ایک انتہائی مرتب و مدوّن اور منظّم کوشش نہایت عقلی سطح پر کی جو ایک ہی وقت میں مشرق و مغرب ہر دو کے لیے خاص اہمیت کی حامل ہے اور اپنے زمان و مکاں میں جدید و متنوع بھی ہے۔

تاریخ فکر میں اہم مسئلہ سوالات کا جواب دینا نہیں ہوتا بلکہ سوال اٹھانا ہوتا ہے۔ تاریخ فلسفہ میں طالیس اوّلین یونانی فلسفی کی اس لیے اہمیت نہیں کہ اس نے نظامِ کائنات کا بہت عمدہ حل پیش کیا تھا بلکہ اس لیے ہے کہ اس نے اس سوال کو پیش کیا کہ کائنات کی اصل کیا ہے اور یہ کیسے معرضِ وجود میں آئی؟ بعد ازاں اسی سوال کے جواب میں فکرِ یونان میں ایسی ایسی فکری کہکشائیں جگمگائیں اور ایسے عظیم نظام ہائے فکر معرضِ ظہور میں آئے جن کی عظمت سے آج بھی کسی کو انکار نہیں۔ لیکن جہاں تک اقبال کا تعلق ہے، اس تناظر میں وہ دہری اہمیت کا

حامل ہے، ایک تو یہ کہ اس نے اپنے اس مقالے میں تاریخِ فکرِ ایران و اسلام کے بارے میں جو سوال اٹھائے وہ تاریخی اور دائمی حیثیت کے حامل ہیں اور تاریخِ فکر کے ہر طالب علم کو آگے بڑھنے کے لیے اپنے اپنے محیط میں ان کے متعلق لازماً سوچنا ہوگا اور ان کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرنا ہوگی اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ اقبال نے جو جواب پیش کیے وہ بھی اپنی جگہ (باوجود بعض مقامات پر اختلافِ نظر کے) نہ صرف اس وقت اہمیت کے حامل تھے بلکہ آج بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس لیے تاریخِ فکرِ ایران اور تاریخِ اسلام کے طالب علم کو اقبال کے مشخص کردہ خطوط پر آگے بڑھ کر ہی اسلامی فکری روایت کی تفہیم و بازیافت ہو سکتی ہے بصورتِ دیگر اسے مستشرقین کی غیر منصفانہ تحقیقات کی بھول بھلیوں کا شکار ہو کر حقیقت کے صدف سے پیش رفت وارتقا کے موتیوں کے حصول سے دست کش ہونا پڑے گا۔ اقبال کے مقالے کے عربی مترجم ڈاکٹر حسین مجیب المصری نے ترجمے کے مقدمے میں اقبال کے مقالے کی روش تحریر کو مضبوط علمی منہاج و اساس پر استوار ذکر کرتے ہوئے مقالے کی صرف اسی خوبی کو اس قابل گردانا ہے کہ اس کو دیگر زبانوں میں شائع ہونا چاہیے تا کہ دوسری اقوام وافراد اس سے استفادہ کر سکیں[۳۳] جب کہ اقبال کے تحقیقی مقالے کے فارسی مترجم ا۔ح۔آریان پور نے مقالے کے بعض اسقام کا ذکر کرنے کے باوجود اس بات کا برملا اظہار کیا ہے کہ اقبال کی ایرانی تاریخِ فلسفہ پر یہ تحقیق اور اس کی روش تا حال بے مثال و بے نظیر ہے اور اس کا ایرانی فرہنگ میں نادر اضافے کے طور پر ذکر کیا ہے۔[۳۴]

اقبال نے اپنے تحقیقی مقالے کے دیباچے میں اس کی تحریر کا دوسرا مقصد بیان کیا تھا:[۳۵]

> تصوف کے موضوع پر میں نے زیادہ سائنٹفک طریقے سے بحث کی ہے اور ان ذہنی حالات وشرائط کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے جو اس قسم کے واقعے کو معرضِ ظہور میں لے آتے ہیں لہٰذا اس خیال کے برخلاف جو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، میں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تصوف ان مختلف عقلی و اخلاقی قوتوں کے باہمی عمل و اثر کا لازمی نتیجہ ہے جو ایک خوابیدہ روح کو بیدار کر کے زندگی کے اعلیٰ ترین نصب العین کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔

۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء مقالے کی تحریر کے دوران اقبال کے مقالے کا یہ ایک بنیادی ہدف اقبال کی نہائی فکر میں کس طرح جاری وساری رہتا ہے اور اس کا کیا مقام ہے اس کے بیان و اثبات کے لیے ہم بغیر کسی تبصرہ کے اقبال کی *تشکیلِ جدید* کے ساتویں خطبے کی ابتدائی سطور کا یہاں ذکر کر کے اس موضوع پر گفتگو کو ختم کرتے ہیں۔

> اجمالاً پوچھیے تو مذہبی زندگی کی تقسیم تین ادوار میں ہو جاتی جن میں ہر دور کو ایمان، فکر اور معرفت کے ادوار سے تعبیر کیا جا سکتا ہے پہلا دور ایمان کا ہے، دوسرا فکر، تیسرا عرفانِ حقیقت کا۔[۳۶]

اسی تسلسل میں پہلے دو ادوار کی وضاحت کرنے کے بعد تیسرے دور کے بارے میں کہتے ہیں:

> مذہب کا یہی آخری مرحلہ ہے جس کے پیشِ نظر میں اس بحث میں جو اس وقت ہمارے سامنے ہے، لفظ مذہب

استعمال کر رہا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس صورت میں تصوف کی اصطلاح اختیار کی جائے تو اسے کوئی اچھی چیز نہیں سمجھا جاتا۔[۳۷]

اقبال کی نہائی فکر کے متعلق سعید احمد اکبر آبادی کہتے ہیں:[۳۸]

علامہ اقبال کے خطبات عصرِ حاضر کا جدید علم الکلام ہیں جس کی ضرورت ارباب فکر و بصیرت عرصے سے محسوس کر رہے تھے۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ یہ علم الکلام ہمارے قدیم علم الکلام سے بدرجہا فائق، مستحکم اور ایمان و بصیرت کو جلا بخشنے والا ہے۔

جب کہ سید علی عباس جلال پوری یوں گویا ہیں:[۳۹]

جہاں تک ان کے فکر اور نظر کا تعلق ہے وہ ایک متکلم ہیں کیوں کہ انھوں نے مشاہیر متکلمین اشعری، غزالی، رازی وغیرہ کی طرح مذہب کی تطبیق معاصر علمی انکشافات سے کرنے کی کوشش کی ہے۔

علامہ اقبال نے جب علی گڑھ میں اپنے 'خطبات' پیش کیے تو صدرِ جلسہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے کہا تھا، ''اقبال نے ایک علم الکلام تشکیل دینے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔''[۴۰] اور یہ بات بدونِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ اقبال نے نئے علم الکلام کی تشکیل کے لیے:

(i) ابتدائی مواد و مسالہ اور خام مال اپنے تحقیقی مقالے کے مطالعات کے دوران حاصل کیا (بعد ازاں خود انھوں نے اس وقت کے نقطۂ نظر سے اتفاق کیا ہو یا اختلاف، بنیاد بہر حال وہیں پڑی)۔

(ii) قدیم علم الکلام کو جدید بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے بھی اقبال کو اساسات یہیں سے مہیا ہوئیں اس لیے کہ جن پہلوؤں سے اس نے اختلاف کیا وہ بھی اس مطالعے کے دوران اقبال کے سامنے آئے اور جن کو اس نے ایک بالکل نئے رنگ میں اپنی فکر میں سمونا تھا اور جنھیں آگے بڑھانا تھا وہ بھی اسی دوران اقبال کے سامنے آئے جو بعد ازاں مزید مطالعات اور غور و فکر سے نہائی شکل میں سامنے آئے۔

تمام نامور ایرانی مفکرین اور رہنماؤں نے انقلابِ اسلامی ایران میں اقبال کی فکر کے حصے کو تسلیم کیا ہے اور انھوں نے انقلاب کی تشکیل میں فکرِ اقبال کے نفوذ و تاثر کا ذریعہ اقبال کی شاعری کو قرار دیا ہے۔ یہ درست ہے کہ اقبال کا یہ تحقیقی مقالہ بلاواسطہ فکرِ ایران پر خاطر خواہ اثرات مرتب نہیں کر سکا لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اقبال کی نہائی شاعرانہ فکر کی تشکیل میں اقبال کا یہ تحقیقی مطالعہ ایک نہایت اہم عنصر اور اساس کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کہ رومی کی طرف رجحان، نظریۂ عشق، حرکت، مردِ مومن، انفرادی خودی کی یافت و نمو اور اس سے اجتماعی خودی کی تعمیر جیسے اساسی تصورات سے کماحقہ، آگاہی اور اپنی اصل کی عظمت و پرمایگی کا شدید احساس یا تو اس تحقیقی مقالے کے دوران اقبال کو ہوا اور یا پھر اس تحقیق کے بعد۔ تحقیق کے زیرِ اثر ان میں بعض بالکل نئی فکری جہات پیدا ہوئیں اور ان کے ذہن پر نئے افق وا ہوئے، لہٰذا اقبال کے اس تحقیقی مقالے کو کاملاً نہ سہی بعض نہایت اہم جہات میں اقبال کی مابعد فکر کی اساس ضرور قرار دیا جاسکتا ہے۔

آخر میں ہمیں اسی بات پر اپنی گزارشات کو تمام کرنا ہے کہ اقبال نے اپنے اس مقالے میں جو طرزِ تحقیق

اپنائی ہے وہ اس وقت بھی منفرد و ممتاز تھی اور خاص اہمیت کی حامل تھی اور آج بھی اس کی انفرادیت و امتیاز اور اہمیت مسلّم ہے۔ مسلمان فلاسفہ کو بالعموم اور پاکستانی اور ایرانی دانشوروں کو بالخصوص اقبال کی اس تطبیقی و وضاحتی روش کو اپنا کر اسلامی فکری روایت کو آگے بڑھانا ہوگا تاکہ انتہائی سرعت کے ساتھ ہر لحہ بدلتے ہوئے عالمی فکری منظر پر اپنی مضبوط اساسات پر انتہائی اعتماد کے ساتھ بین الاقوامی چیلنجوں کا علمی، فکری اور عملی ہر سطح پر مقابلہ کرنے کے لیے نہ صرف خود تیار ہوں بلکہ آنے والی نسلوں کو مضبوط اساس فراہم کر سکیں۔

حوالے اور حواشی

۱ محمد اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (مترجم نذیر نیازی)، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص۔۹

۲ محمد اقبال، مقالاتِ اقبال (مرتب سید عبدالواحد معینی)، شیخ محمد اشرف، ۱۹۶۳ء، ص۔۱۹۰

۳ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، مقالاتِ حکیم (ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ)، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص۔۱۲۸

۴ محمد اقبال، اقبال نامہ حصہ اوّل مرتبہ شیخ عطاء اللہ، شیخ محمد اشرف، ۱۹۴۵ء، ص۔۱۰۹

۵ محمد اقبال، اقبال نامہ حصہ اوّل، مرتبہ شیخ عطاء اللہ، شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۴۵ء، ص۔۴۲۶

۶ محمد اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (مترجم نذیر نیازی)، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص۔۴۰

۷ ڈاکٹر عشرت حسن انور، اقبال کی مابعد الطبیعیات، اقبال اکادمی، ۱۹۷۷ء، دیباچہ

۸ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکرِ اقبال، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص۔۱۰، ڈاکٹر قاضی عبدالمجید، اقبال کی شخصیت اور اس کا پیغام، دانائے راز، مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۷ء، ص۔۱۹۲، ابوظفر عبدالواحد ایم اے علیگ، اقبال کا ذہنی ارتقا، دانائے راز، مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۷ء، ص۔۲۲۱، محمد اقبال کلیاتِ اقبال دیباچہ بانگِ درا، از شیخ عبدالقادر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۴ء، ص۔۱۳

۹ مرتبہ بی اے ڈار، انوارِ اقبال، اقبال اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۔۱۷۶

۱۰ ڈاکٹر ایس ایم۔ منہاج الدین، افکار و تصوراتِ اقبال، کاروانِ ادب، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص۔۱۳۔۱۴

۱۱ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، عروجِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص۔۳۴۱

۱۲ مرتبہ یونس جاوید، صحیفہ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص۔۲۶۲

۱۳ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، اقبال اور قرآن، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص۔۳۶

۱۴ ڈاکٹر این میری شمل، شہپرِ جبریل، مترجم ڈاکٹر محمد ریاض، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص۔۵۹

۱۵ ڈاکٹر این میری شمل، شہپرِ جبریل، مترجم ڈاکٹر محمد ریاض، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص۔۵۹

۱۶ عباس مہدوی اشرف، علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، ادارہ کل فرہنگ و ہنر استانِ مازندان، ص۔۳،۴

۱۷ فضل اللہ رضا، محمد اقبال، انجمن روابط فرہنگی ایران و پاکستان، تہران، ص۔۷، ۸
۱۸ حبیب یغمائی، اقبال و شعر، گذارش کنگرہ بزرگداشت اقبال، موسسہ حسینیہ ارشاد، تہران، ۱۳۵۲، ص۔۱۷۳
۱۹ سید غلام رضا سعیدی، اقبال شناسی، انتشارات بعثت، تہران، ص۔۲۰۲
۲۰ احمد احمدی، دانائی راز، چاپخانہ زوار، تہران، ص۔۵، ۷
۲۱ محمد تقی مقتدری، اقبال، متفکر و شاعرِ اسلام، تہران چاپخانہ دولتی، ۱۳۲۶، ص۔۲۱، ۲۲
۲۲ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عبدالرفیع حقیقت کی، اقبالِ شرق، تہران، انتشارات بنیاد نکوکاری، ۱۳۵۷، ص۔۳۲، ۴۳
۲۳ ڈاکٹر مہدی محقق، 'اقبال و فلسفۂ اسلامی'، گذارش کنگرہ بزرگداشت اقبال۔ موسسہ حسینیہ ارشاد، تہران، ۱۳۵۲، ص۔۸۴
۲۴ سیّد محمد محیط طباطبائی، 'شناسائی اقبال'، گذارش کنگرہ بزرگداشت اقبال۔ موسسہ حسینیہ ارشاد تہران، ۳۵۲، ص۔۱۴۰
۲۵ محمد اقبال، کلیاتِ اشعارِ فارسی مولانا اقبال لاہوری، مقدمہ از احمد سروش، انتشارات کتابخانہ سنائی، ۱۳۶۸، ص۔۳۲
۲۶ محمد حسین مشائخ فریدنی، نوائے شاعرِ فردا یا اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی، موسسہ مطالعات فرہنگی، ۱۳۶۸، مقدمہ
۲۷ ڈاکٹر شھین دخت مقدم صفیاری، نگاہی بہ اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۔۳۷
۲۷۔الف ان تمام آراء میں بیان حقیقت سے زیادہ حسن عقیدت اور مبالغے کو دخل ہے۔ علامہ کی سوانح اور فکری ارتقاء پر مجموعی نظر اور اس مقالے کے خصوصی تجزیے سے ان تبصروں کی تائید نہیں ہوتی (مدیر)
۲۸ ڈاکٹر محمد اقبال، فلسفۂ عجم، مترجم میر حسن الدین، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۹ء، ص۔۹، ۱۰
۲۹ Allama Muhammad Iqbal, The Development of Metaphysics in Persia ص۔۳۳، ۳۴
۳۰ Allama Muhammad Iqbal, The Development of Metaphysics in Persia ص۔۷۷، ۷۶، ۲۳
۳۱ علامہ محمد اقبال، مقالاتِ اقبال، مرتبہ سید عبدالواحد معینی۔ شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص۔۱۵۳
۳۲ محمد اقبال، ماوراء الطبیعہ فی ایران (مترجم ڈاکٹر حسین مجیب المصری) مقدمۂ مترجم قاہرہ مکتبہ الانحلو مصریہ، ۱۹۸۶ء، ص۔۲۳۰، ۲۴۰
۳۳ محمد اقبال، ماوراء الطبیعہ فی ایران (مترجم ڈاکٹر حسین مجیب المصری) مقدمۂ مترجم قاہرہ مکتبہ الانحلو مصریہ، ۱۹۸۶ء، ص۔۵

۳۴ محمد اقبال، سیر فلسفه در ایران، (مترجم ا۔ح۔آریان پور) مقدمۂ مترجم ط۔ی تہران، نشریہ، شمارہ۔۸
۳۵ محمد اقبال، فلسفۂ عجم (مترجم میر حسن الدین) نفیس اکیڈمی، کراچی، ص۔۱۶
۳۶ محمد اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (مترجم نذیر نیازی)، بزمِ اقبال، لاہور، ص۔۲۷۸
۳۷ محمد اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (مترجم نذیر نیازی) بزمِ اقبال، لاہور، ص۔۲۷۹
۳۸ سعید احمد اکبر آبادی، خطباتِ اقبال پر ایک نظر، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونی ورسٹی، سرینگر، ۱۹۸۳ء، ص۔۱۰
۳۹ سید علی عباس جلال پوری، اقبال کا علمِ کلام، مکتبہ فنون، ۱۹۷۳ء، پیش لفظ
۴۰ ڈاکٹر سید ظفر الحسن، خطبۂ صدارت، المعارف شمارہ ۳، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۔۱۸